تحقیق

مثنوی بیانِ نموداریٔ شانِ نبوّت و ولایت
اور غالب کے چند مذہبی معتقدات

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

مثنوی بیانِ نموداری

غالب کی رند مشربی اور آزادہ روی کا صُور اس شدت سے پھونکا گیا ہے کہ لگتا ہے غالب مذہب اور مذہبی اعتقادات کو قطعاً خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہ درست ہے کہ وہ دین کی بعض تعبیرات اور تاویلات کو ہر منفرد فکر رکھنے والے کی طرح ماننے میں تامّل کرتے تھے لیکن جہاں تک دین کی روح اور اس کے عقائد کا تعلق ہے، غالب اس کے سچے ماننے والے اور اس کا احترام کرنے والے تھے۔ اس ضمن میں ان کی بعض اہم نثری اور شعری کاوشیں برہانِ ناطق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً نثر میں "مہرِ نیم روز" کے دو باب یعنی "آغاز" اور "زمزمۂ نعت" اور شاعری میں ان کے حمدیہ و نعتیہ قصائد اور بعض مثنویات۔ ان کے قصائد تو اس لیے بھی لائقِ توجہ ہیں کہ یہ ان کی پختگیٔ سال و سن کا ثمر ہیں۔

غالب نے فارسی میں متعدد چھوٹی بڑی مثنویاں لکھیں۔ ان میں ان کی اہم ترین اور طویل ترین مثنوی "ابرِ گہربار" ہے۔ جس کا مفصل جائزہ میں اپنے ایک سابقہ مقالے میں لے چکا ہوں۔ زیرِ نظر مقالے میں مجھے ان کی جس مثنوی کا محاکمہ کرنا ہے وہ ہے "مثنوی بیانِ نموداریٔ شانِ نبوّت و ولایت کہ درحقیقت پرتوِ نور الانوار حضرتِ الوہیت است"۔ یہ مثنوی بھی غالب کی نہایت اہم کاوش ہے، اور اس میں انبیاء اور اولیاء سے استمداد، اولیاء کے عرس، معاشرے میں رسوم کی اہمیت اور معنویت اور امتناعِ نظیرِ خاتم المرسلینؐ جیسے مسائل پر غالب نے اپنے منفرد شعری و فکری اسلوب میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس مثنوی کا محرک اجمالاً بیان کر دیا جائے۔ حالی نے "یادگارِ غالب"

میں اس مثنوی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مولانا فضلِ حق مرزا (غالب) کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور ان کو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی، انہوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھو جس میں ان کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاص کر امتناعِ نظیرِ خاتم النبیینؐ کے مسئلے کو زیادہ شرح اور بسط کے ساتھ بیان کرو"۔[۱]

غالب کی متذکرہ مثنوی اصل میں شاہ اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" کا شعری جواب تھی۔
شاہ صاحب نے اپنی اس مشہور اور ہنگامہ خیز کتاب میں شرک کی چار اقسام گنوائی تھیں یعنی :

ا اشراک فی العلم

ب اشراک فی التصرف

ج اشراک فی العبادت

د اشراک فی العادت

"اشراک فی التصرف" کے باب میں انہوں نے لکھا تھا کہ :

"اکثر لوگ انبیاء و اولیاء کی شفاعت پر بہت بھول رہے ہیں۔ اور اس کے معنی غلط سمجھ کر اللہ کو بھول گئے ہیں۔ شفاعت کی حقیقت سمجھ لینا چاہیے۔ سنا چاہیے کہ شفاعت کہتے ہیں سفارش کو اور دنیا میں سفارش کئی طرح کی ہوتی ہے جیسے ظاہر کے بادشاہ کے ہاں کسی شخص کی چوری ثابت ہو جائے اور کوئی امیر و وزیر اس کو اپنی سفارش سے بچالے ـــــ اس کو شفاعتِ وجاہت کہتے ہیں یعنی اس امیر کی وجاہت کے سبب سے اس کی سفارش قبول کی۔ اس قسم کی سفارش اللہ کی جناب میں ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی اور جو کوئی نبی و ولی کو یا امام اور شہید کو یا کسی فرشتے یا پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے وہ اصلی مشرک ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے کچھ معنی ہی نہیں سمجھے ـــــ اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور

فرشتے، جبریل اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے اور
ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے اور ایک اور
ہی عالم اس جگہ قائم کر دے۔[۲]

"اشتراک فی العادت" کے ضمن میں شاہ صاحب نے "احمد بلا میم" کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں کی مذمت کی تھی جنھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے "انا احمد بلا میم" کا قول منسوب کیا ہے اور جنھوں نے اسی طرح کی بڑی سی عبارت بنا کر اس کا نام "خطبۃ الافتخار" رکھا ہے۔ اسی بات میں انھوں نے نصاریٰ کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ موجودہ اور اگلی دنیا کے سارے کاروبار پر حضرت عیسیٰؑ کے تصرف کے قائل ہیں:

"اور اسی طرح کا عقیدہ جاہل مسلمانوں کو حضرت پیغمبرؐ کی جناب
میں ہے۔"[۳]

یہ ہے خلاصہ ان مباحث کا جو تفصیل سے "تقویۃ الایمان" میں اٹھائے گئے تھے اور جن کا جواب غالب نے اپنے دوست اور ممتاز مجاہد اور عالم فضلِ حق خیرآبادی (شاگرد شاہ عبدالقادرؒ) کی فرمائش پر مثنوی کی صورت میں نظم کیا۔ اس مثنوی میں غالب نے مذہبی رسوم، انبیاء و اولیاء سے استمداد اور خاتم المرسلینؐ کی نظیر کے ضمن میں روایتی مسلّم معتقدات اور اپنے منفرد تصوریات کو آمیخت کر کے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے ان کی انبیاء و اولیاء سے شدید عقیدت کا بھی بخوبی اظہار ہوتا ہے اور نبیِ آخرالزماں سے ان کی اٹوٹ محبت بھی آئینہ ہوتی ہے۔ اپنے موقف کی وضاحت کے لیے انھوں نے بعض جگہ بڑے چیکھا شاندار میں حسی مثالیں دے کر شاہ اسمٰعیل شہید کے موقف کی تردید کی ہے اور بعض جگہ جوشِ تردید میں شاہ صاحب کو خوب جلی کٹی بھی سنائی ہیں۔

ذیل میں اس مثنوی کا (بیشتر) ترجمہ (اور کہیں کہیں خلاصہ) پیش کیا جاتا ہے۔ چند مقامات پر مثنوی مذکور کے کچھ اشعار بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ غالب کہتے ہیں:

"چند اصولی نکتے بیان کرتا ہوں تاکہ ان سے دیدہ ور کو سرمہ اور
اندھے کو بصارت مل سکے۔ حق حق ہے اور اسی کے نور سے آسمانوں اور
زمینوں کو کلید میسر آئی۔ حق کے علاوہ تجھے جو کچھ نظر آتا ہے وہ اسی کی
نشانیاں ہیں۔ اللہ نے خلوت سے خویشتن پر جلوہ آرائی فرمائی اور خلوت کو
فروغِ انجمن حاصل ہوا۔ حق کے خود پر جلوۂ اولیں کے نتیجے میں نورِ محمدؐ کی

مشعل روشن ہوئی۔ اس نور سے بزمِ ظہور میں دور و نزدیک جو کچھ پنہاں تھا ظاہر ہو گیا بالکل اسی طرح جیسے سورج کی روشنی میں ذرّے اپنا نقاب اتار پھینکتے ہیں۔ حضورِ اکرمؐ نورِ حق ہیں اور ان کے توسط سے یہ نور اولیاء میں ظہور کرتا ہے۔ ہر ولی نبیؐ سے نور پذیر ہوتا ہے جیسے چاند سورج سے کسبِ نور کرتا ہے۔ تو نبیؐ و ولی سے استمداد کر اور یہ نہ سمجھ کر یہ کوئی ناجائز کام ہے۔ جس شخص کی قوت و استعداد کو حق سے تقویت ملتی ہو تو وہ اس سے جو کچھ بھی طلب کرے گا وہ دراصل خدا ہی سے طلب کرے گا۔ اگر تو لبِ دریا سے پانی پیے تو بظاہر تو تُو یہ پانی دریا کی موج سے حاصل کر رہا ہوتا ہے لیکن درحقیقت تو دریا ہی سے اپنی پیاس بجھا رہا ہوتا ہے۔ جب تو یزدانِ پاک سے اعانت کا طلب گار ہوتا ہے تو اگر تو "یا معین الدین!" پکار لے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ چونکہ بیوقوفوں کی عقل ناقص اور نارسا ہے اس لیے وہ حرفِ ندا کے مسئلے میں الجھ جاتے ہیں۔ اب دیکھو شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر جیسے بے مثال اور یکتا اصحاب نے نامِ نبیؐ اور اسمائے اولیاء کو حرفِ ندا کے ساتھ پکارنے کو جائز قرار دیا ہے۔ پھر ایک اور قدسی سرشت حکیم نے جو پیرانِ چشت کے مسلک کا رہنما، شیخِ وقت اور خضرِ طریقت تھا — یعنی کلیم اللہ دہلویؒ — فرمایا کہ پیروں سے استمداد روا ہے۔ اسی طرح شیخ المشائخ فخرِ دیں، دنیائے علم و یقیں کے آفتابؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ ہاں کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہم پیروں سے مدد طلب کرتے ہیں۔ ہم تو اصلاً خدا ہی سے حاجت روائی کے طالب ہیں لیکن اس بارگاہِ رفیع میں بخشش کے لیے ہم ان پیروں کو بطور شفیع لاتے ہیں۔"

اس کے بعد غالب، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعض متبرک آثار کا ذکر کرتے ہیں جو دہلی کی قدیم عمارتوں میں محفوظ تھے۔ مثلاً ان کا موئے مبارک اور ان کا نقشِ قدم وغیرہ۔ لکھتے ہیں:

"ان کے خوشبودار موئے مبارک کا رشتہ ہماری رگِ جاں سے بندھا ہے۔ یہ بال روح سے بھی زیادہ پاکیزہ جسم پہ اُگا ہے اور اسے بالیقیں آبِ حیات سے نمو ملی ہے — جو صاحبِ دل اور صاحبِ ایمان ہے وہ حضورؐ کے نقشِ قدم

سے عشق کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ یہ نقشِ قدم دراصل عشاق کے دل کی تہوں میں اتر چکا ہے۔ یہ کسی ایسے بد گہر کے دل میں کیسے بیٹھ سکتا ہے جو پتھر سے بھی سخت تر ہو۔ مصر سے یوسفؑ کے پیراہن آتی ہے تو دیدۂ یعقوبؑ اس کے دم سے دوبارہ روشن ہو جاتا ہے مو وہ چادر اور پیراہن جو رسول اللہ سے متعلق رہ چکے ہیں، امت ان پر جان کیوں نہ چھڑکے گی"۔

چونکہ مثنوی میں حقائق کا بیان مطلوب ہوتا ہے اس لیے اس کی روایت میں حکایت کا دلپذیر اسلوب عموماً برتا جاتا ہے۔ غالب بھی ایک مختصر مگر معروف حکایت سگِ لیلیٰ سے اپنے موقف کو قابلِ قبول اور موثر بناتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

در عرب بود است منعم زادۂ
قیس نامی دل بہ لیلیٰ دادۂ
بر سگی کز کوچۂ لیلاستی
قیس از خویشش فزونتر خواستی
میتوانی گفت ہاں اے تن پرست!
پیرِ کنعاں بود پیراہن پرست
یا تواں گفتن کہ خود چوں بودہ است
سگ پرستی کیشِ مجنوں بودہ است؟
حاش للہ! کاینچنیں باشد نورد
رفت از حد سوئے ظن کافر نگرد
عشق گر با پیرہن و ربا ردا ست
نیست پیرہن جامہ از بہرِ خداست [۲]

جوں جوں غالب آگے بڑھتے ہیں، ان کا زورِ کلام اور جوشِ اظہار متلاطم ہوتا چلا جاتا ہے فرماتے ہیں:

"خدا نے ہماری خاطر رسول اللہ کو مبعوث فرمایا۔ ہم نے ان کے دین کو حق کی خاطر قبول کیا۔ اب اگر ہم ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو دراصل ہم خدا ہی کے باعث ان کو دوست رکھتے ہیں۔ کیا طالبِ دیدارِ یار،

آثارِ بار کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتا؛ حضورِ اکرمؐ ہم تک پیغام خدا لے کر آئے۔ انہوں نے ہمیں رستہ دکھایا۔ اسے ہمارے لیے آسان فرمایا اور پھر رخصت ہو گئے۔"

عرس برپا کرنا، شمع و چراغ جلانا، انگیٹھی میں عود سلگانا، ایک بڑے کمرے میں جمع ہو کر قرآن کی چند آیات تلاوت کرنا، پھر بھوکوں کو کھانا کھلانا اور مُردوں کو ایصالِ ثواب کرنا، اگر یہ سب اولیاء کی ارواح کو راحت پہنچانے کے لیے ہے تو اصلاً خدا ہی کے لیے ہے۔ ہم اگر اولیاء کو معزز سمجھتے ہیں تو ان کو رومی یا شامی ہونے کے باعث نہیں بلکہ اس لیے کہ یہ خدا کے رازداں تھے۔ آخر حق پرستوں کو باطل سے کیا کام؟ اور وہ جو لیلیٰ کا عاشق ہے اس کو محمل سے کیا لینا۔ اگر وہ لیلیٰ کے دیدار کا بھوکا نہ ہوتا تو محمل پر نظر کیوں مرکوز کرتا؟ اگرچہ اس کی روح لیلیٰ سے ہم کلام ہونے کو بے قرار ہوتی ہے لیکن محمل کو بے تعلق جان کر اسے ٹھوکر تو نہیں ماری جا سکتی!"

"اللہ اور حدِ ادب کا پاس کر کیونکہ بے ادب کی راہ تلوار کی دھار پر ہوتی ہے۔ اولیاء سے الجھنے والے دیوانے ہوتے ہیں تو اپنے پیشروؤں کو بُرے لفظوں سے یاد کرتا ہے اور خود کو بڑا عاقل اور دانشور سالک کہتا ہے۔ اگر اسی کا نام سلوک اور سفر ہے تو بتا تیری منزل کہاں ہے؟ تو نے لا الٰہ تو کہہ دیا مگر الا اللہ کہاں ہے؟"

"ہر سرزمین کی خاص رسمیں ہوا کرتی ہیں۔ آخر تو ان رسوم کی نفی کر کے جا بتا کیا ہے؟ رہا رسوم کفر کی نفی کا معاملہ تو ہم بھی ان کی نفی کرتے ہیں۔ نفیِ کفر اربابِ صفا کا آئین ہے لیکن اے تاریک دل! آخر نفیِ فیض کہاں کی رسم ہے؟

اے گرفتارِ خمِ پیچ و خیال
نفیِ بے اثبات نبود جز ضلال[۵]

"اب اگر تو یہ کہے کہ میں تو "اثباتِ حق" کر رہا ہوں تو سوال یہ ہے

کہ پھر تو کس لیے آیاتِ حق کا منکر ہے؟ کیا اولیاء دربارِ حق کے خواص میں سے نہیں یعنی آیاتِ الٰہی نہیں ہیں؟ آخر ابنیاء کے معجزات کس کی نشانیاں ہیں اور ان صفات کا ظہور کس کی ذات کا مرہونِ منت ہے؟ جب تو اس حد تک انکار پر اتر آیا ہے تو آخر آیاتِ حق میں سے تو نے مانا کس کو ہے؟"

مثنوی کے آخر میں غالب نے "خاتم المرسلینؐ" کی نظیر کے مسئلے کو چھیڑا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مسئلے پر انہوں نے فضلِ حق خیر آبادی کے موقف کی بجائے دراصل شاہ اسمٰعیل شہید کے موقف کی تائید کی ہے۔ اگرچہ بعد ازاں اس مثنوی میں چند شعر بڑھا کر فضلِ حق اور شاہ اسمٰعیل کے موقف کو تطبیق دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ انہوں نے حضور اکرمؐ کے لیے "سورج" کی علامت استعمال کی ہے جو تمام روایتی تہذیبوں میں حق، حیات اور نمو کی نمائندہ ہے۔ لکھتے ہیں:

دیں کہ می گوئی توانا کردگار
چوں محمد دیگری آرد بکار
با خداوندِ دو گیتی آفریں
ممتنع نبود ظہورِ ایں چنیں
آنکہ مہر و ماہ واختر آفرید
میتواند مہر دیگر آفرید
قدرتِ حق بیش ازیں ہم بودہ است
ہر چہ اندیشی کم از کم بودہ است
لیک در یک عالم از روئے یقیں
خود نمی گنجد دو ختم المرسلیںؐ
یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است
قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمی
ہم بود ہر عالمے را خاتمی

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود[۹]

در یکے عالم دو تا خاتم مجو ئی
صد ہزاراں عالم و خاتم بگوئی[۱۰]

بعد کے اضافہ شدہ اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ :

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں تشنیہ راہ نہیں پا سکتا۔ امکان کی میم احمد میں گوشہ گیر ہے۔ جب تو امکان سے نکل جائے گا تو تجھے علم ہو جائے گا کہ آگے کیا ہے (یعنی احد ہے)۔"

"صانع عالم نے یہ اہتمام فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا میں کوئی مثیل نہ ہو۔ اے فقیہ! یہ از رہِ عجز نہیں از رہِ اختیار ہے۔ نبی اکرمؐ بے ہمتا ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ خدا جو نبیؐ کی ذات کے ساتھ سایہ بھی پسند نہیں کرتا وہ اس جیسا نقشِ دیگر پیدا فرمانا کیسے گوارا کر سکتا ہے؟"

گویا غالب نے شاہ اسمٰعیل کے موقف کی تائید کرتے ہوئے یہ بھی نتیجہ نکالا کہ خاتم النبیینؐ کا مثل ممکن بالذات ہوتے ہوئے بھی ممتنع بالذات ہے اور یوں فضلِ حق خیر آبادی کو خوش کر دیا۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است
لاجرم مثلش محالِ ذاتی است[۱۱]

غالب کا موقف بالتفصیل پیش ہو چکا۔ اب اس کے بعض نکات پر گفتگو کی جاتی ہے :

اوّلاً غالب نے استمداد اور شفاعت کے باب میں شاہ اسمٰعیل کے موقف کو شد و مد سے رد کیا ہے لیکن لگتا ہے کہ انہوں نے شاہ صاحب کے موقف کا ہمدردانہ اور تفصیلی مطالعہ نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے اٹھائے گئے نکات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے گویا شاہ صاحب نفسِ شفاعت ہی کے سرے سے منکر تھے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ شاہ صاحب نے "تقویۃ الایمان" میں شفاعت کی تین قسمیں بیان کی ہیں :

۱۔ شفاعتِ وجاہت

۲۔ شفاعتِ محبت

۳۔ شفاعت بالاذن

شاہ صاحب نے ان میں تیسری شفاعت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ ایک چور کی تمثیل سے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثابت ہوگئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں اور چوری کو کچھ اس نے اپنا پیشہ نہیں ٹھہرایا مگر نفس کی شامت سے قصور ہوگیا۔ اس پر شرمندہ ہے اور رات دن ڈرتا ہے ــــ بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر و وزیر کی پناہ نہیں ڈھونڈتا ــــ اور رات دن اسی کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھیے میرے حق میں کیا حکم فرمادے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اس پر ترس آتا ہے مگر آئین بادشاہت کا خیال کرکے بے سبب درگذر نہیں کرتا کہ کہیں لوگوں کے دل میں اس آئین کی قدر نہ گھٹ جائے۔ کوئی امیر و وزیر اس کی مرضی پاکر اس تقصیر وار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ امیر کی عزت بڑھانے کو اس کی سفارش کا نام کرکے اس چور کی تقصیر معاف کردیتا ہے۔ اس امیر نے اس چور کی سفارش اس لیے نہیں کی کہ اس کا قرابتی ہے یا آشنا یا اس کی حمایت اس نے اٹھائی بلکہ محض بادشاہ کی مرضی سمجھ کر ــــ اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں ــــ اللہ کی جناب میں اسی قسم کی شفاعت ہو سکتی ہے اور جس نبی، ولی کی شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے اس کے معنی یہی ہیں۔"[۱۲]

غالب نے خانوادۂ ولی اللٰہی کے دو افرادِ فرید شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کو شفاعت کے حق میں بطور سند پیش کیا ہے اور آگے چل کر وضاحت کردی ہے کہ پیروں سے استمداد محض مجازی ہے ورنہ حقیقتہً ہم اللہ ہی سے حاجت روائی کے طالب ہیں۔ غالب کا یہ موقف اور تصریحی بیان اصلاً اہلِ علم اور صاحبانِ شعور کا بیان ہے جبکہ شاہ اسمٰعیل شہید عامۃ الناس کے گمراہ تصورِ شفاعت کو بیان کرکے اس پر طنز و طعن کر رہے تھے جو محض اس لیے گناہ پر گناہ کیے چلے جاتے ہیں کہ حدیث میں "الطالح لی" کی بشارت آئی ہے۔ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب، شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر یعنی فرزندانِ شاہ ولی اللہ کا موقف تو شد و مد سے پیش کرتے ہیں لیکن خود شاہ ولی اللہ کے موقف سے نہ معلوم کیوں صرفِ نظر کرتے ہیں جو شاہ اسمٰعیل شہید کے موقف کی تائید کرتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ

خود شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ خانوادۂ ولی اللٰہی میں جو مرتبہ خود اس خاندانِ فکر کے بانی شاہ ولی اللہ کو حاصل ہے وہ نہ شاہ عبدالعزیز کو حاصل ہے نہ شاہ عبدالقادر کو ــــ اب دیکھیے کہ شاہ ولی اللہ، اولیاء سے استمداد و شفاعت اور اس کے لیے روا رکھے جانے والے طریقوں کی کس قدر پُر زور مذمت کرتے ہیں۔ "تفہیماتِ الٰہیہ" میں لکھتے ہیں:

"میں ان پیرزادوں سے جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں ــــ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے۔ اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے آپ کو ہادی و مھدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے ــــ یہ سب راہزن ہیں دجّال ہیں۔ کذّاب ہیں۔"[۱۳]

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لیے اجمیر یا سالار مسعود کی قبر یا ایسے ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا گناہ اس سے کمتر ہے۔ آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں کیا فرق ہے۔ جو لوگ لات اور عُزّیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے ان کا فعل ان لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم ان لوگوں کے برعکس اِن لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ خاص ان کے معاملہ میں شارع کی نص موجود نہیں ہے مگر اصولاً ہر وہ شخص جو کسی مردے کو زندہ ٹھہرا کر اس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اس کا دل گناہ میں مبتلا ہے۔"[۱۴]

استمداد اور شفاعت کے ساتھ ہی جڑا ہوا مسئلہ ایسی رسوم کا ہے جنہیں مذہب کا درجہ دے دیا گیا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عامۃ الناس دین کو انہی رسوم میں منحصر سمجھ کر گمراہ ہو گئے ہیں۔ ان گمراہیوں اور بوالعجبیوں کی عبرت ناک تفصیل "تقویۃ الایمان" اور اس مدرسۂ فکر کی بعض دیگر کتب میں ملتی ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحب نے شاہ مدار کی چھڑی، امام قاسم اور پیر دستگیر کی صحنک، امام کا چبوترہ، سیتلا کا استھان یا بھوانی، کالی یا کالکا کا تھان، یا پھر ساعت ماننا، برہمن سے شگون لینا، کلوا پیر کی دہائی، جانور کا کان چیرنا،

شاہ عبدالحق کا توشہ، حضرت بی بی کی صحنک، شاہ مدار کی نیاز اور اسی طرح کے دیگر توہمات کا ذکر کیا ہے اور معقول و منقول دونوں کی رُو سے انہیں رد کیا ہے۔

خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب 'اردو میں وہابی ادب' میں ڈاکٹر اشپرنگر کے ذاتی ذخیرہ موجود ٹیوبنگن میں "قانون النسا" نامی ایک مخطوطے کا ذکر کیا ہے جس میں مسلمان عورتوں کی عادات، توہمات اور سطحی اعتقادات کا نہایت عبرت خیز بیان ہے۔ مثلاً خدائی رات، پیر دیدار کے کونڈے، بی بی کی صحنک بابا کی پڑیاں، مشکل کشا کے دونے، رجب ہٹیلے کے مرغ، شاہ سلطان کے روٹ، بی جاگتی جوت کی نوبت، بی سہاگن کی کڑاہی، بی ٹیک کی سپاری، بی کنشٹ کا کونڈا، بی آس کی ٹکیا، بارہ وفات میں بارہ روز بتاشوں پھانکہ، شاہ جلال بخاری کا کونڈا، خواجہ خضر کی ناؤ، شیخ سدو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں مولانا خرم علی کے رسالہ "نصیحۃ المسلمین" میں مندرجہ بالا قسم کی بدعات کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔

رہا امتناع نظیر خاتم النبیینؐ کا مسئلہ تو اس کے پیدا ہونے سے ایک عرصہ قبل عہد عباسی میں اس سے ملتا جلتا مسئلہ تقوبۃ الالہ کے ضمن میں پیدا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنا مثل پیدا کرسکتا ہے یا نہیں؟ یہ اور اس طرح کے دیگر سوال دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ اللہ چونکہ قادر مطلق ہے اس لیے اپنا مثیل پیدا کرسکتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو اس کی قدرت کاملہ پر حرف آتا ہے۔ بیسویں صدی کے ممتاز متکلم مولانا محمد ایوب دہلوی نے اس قبیل کے اٹھائے گئے سوالات کو لایعنی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اور یہ کہنا کہ اللہ اپنے اوپر قادر ہے یعنی اللہ مقدور ہوسکتا ہے، حالانکہ غیر مقدور ہی کو اللہ کہتے ہیں تو اس قسم کے سوالات لغو ہیں کیونکہ اس قسم کے سوالات کے یہ معنی ہوئے کہ غیر مقدور، مقدور ہوسکتا ہے۔ غیر مثل، مثل ہوسکتا ہے تو جن سوالات کے اجزا میں منافات ہوں، وہ سوالات ہی غلط ہیں۔"[۱۵]

آگے چل کر اپنے موقف کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

> "یہاں ایک نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ قادر ہونا مقدور ہونے کو چاہتا ہے۔ قادر ہونا قادر ہونے کو نہیں چاہتا تاکہ قادر کو مقدور ہونا ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ قادر غیر قادر پر قادر ہے۔ قادر پر قادر نہیں ہے ورنہ

> قادر مقدور ہو جائے گا اور قادر قادر نہیں رہے گا . . . . اور قادر علی الذات نہ ہونا نقص اور عیب اور کمزوری نہیں بلکہ کمال حسن اور قوت ہے اور جو لوگ قادر علی الذات ہوتے ہیں یعنی خودکشی پر قادر ہوتے ہیں درحقیقت انتہائی عاجز ہوتے ہیں۔ انتہائی بے بسی اور عاجزی کے ساتھ موت و فنا تک پہنچ جاتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو مرنے نہ دیتے۔[19]

نظیرِ خاتم النبیینؐ کے باب میں شاہ اسماعیل شہید کے موقف کی بنیاد دراصل قرآنِ حکیم کے اس طرح کے ارشادات پر تھی۔ مثلاً یہ کہ:

> اللہ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

یا مثلاً یہ کہ:

> ولو شئنا لبعثنا فی کل قریۃ نذیراً
>
> یعنی: اگر ہم چاہیں تو ہر ہر قریے میں پیغمبر بھیج دیں۔

گویا خدا اپنی ہر چاہت اور ہر ارادے پر پوری طرح قادر ہے لیکن چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خاتم النبیین کہہ چکا ہے لہٰذا وہ اس کے خلاف کرے گا نہیں۔ یہیں آ کے غالب اور شاہ اسمٰعیل شہید کا موقف مشترک صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہیں سے فضلِ حق خیرآبادی کو غالب سے شکایت پیدا ہوئی اور ان کے کہنے پر غالب نے اپنی مذکورہ مثنوی میں چند شعر بڑھا کر فضلِ حق خیرآبادی کو خوش کرنا چاہا۔

فضلِ حق خیرآبادی نے مسئلہ امتناع النظیر پر نہ صرف غالب سے مثنوی لکھوائی بلکہ اس پر شاہ اسمٰعیل شہید سے ان کے مناظرے بھی ہوئے۔ علاوہ ازیں اسی مسئلے پر انھوں نے شاہ صاحب کے شاگرد مولوی حیدر علی رامپوری کے خیالات کا رد "امتناع النظیر" نامی رسالے کے عنوان سے لکھا جو مولانا حفیظ اشرف کی تہذیب و تحشیہ کے ساتھ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس رسالے میں انھوں نے شیخ عبدالوہاب نجدی اور حیدر علی رامپوری کے باب میں بہت درشت زبان استعمال کی۔ شیخ نجدی کو ضال، مضل اور شیطان قرار دیا اور رامپوری صاحب کے لیے ملحد، ہمسایۂ شیطان، سرگروہِ جہّال، فرومایہ و فروپایہ اور سگِ دیوانہ کے القاب استعمال کیے اور یوں اس باب میں وہ غالب سے بازی لے گئے۔ اگر اس رسالے کا اسلوب اس قدر درشت اور شاتمانہ نہ ہوتا تو اس کی اور ہی قدر و قیمت ہوتی۔ بہرحال اس رسالے سے فضلِ حق خیرآبادی کے

منطق پہ حاکمانہ عبور کی ناقابلِ تنسیخ گواہی ضرور ملتی ہے۔ مسئلہ امتناعِ النظیر پر ان کا موقف کتاب مذکور کے دو جملوں میں سمٹ آیا ہے۔ کہتے ہیں:

الف۔ "حقیقتِ محمدیہ نزد حضراتِ صوفیہ عبارت از حقیقتِ جامعۂ جمیع مراتبِ امکانیۂ علویہ و سفلیہ است و تعددِ آں محال بالذات است" [۱۷]

ب۔ "واجب بالذات و ممتنع بالذات تحتِ قدرت داخل نیست" [۱۸]

اب گویا شاہ اسمٰعیل شہید کا موقف تو یہ تھا کہ اللہ، حضورِ اکرمؐ جیسے انبیاء پیدا کرنے پر قادر ہے جبکہ

مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا موقف یہ تھا کہ نظیرِ خاتم النبیینؐ ممتنع بالذات ہے۔ چونکہ اللہ نے خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دیا ہے اور خود حضورِ اکرمؐ نے بھی فرمایا ہے کہ:

انا خاتم النبیین، لا نبی بعدی

اور نبی بحوالہ آیۂ کریمہ:

ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ

وہی بات کہتا ہے جو اللہ کی جانب سے بذریعہ وحی اس کے قلب پر القاء کی جاتی ہے اس لیے اگر خدا کی قدرت میں خاتم النبیینؐ جیسا ایک بھی نبی پیدا کرنے کا امکان ہو تو یہ امکان، امکانِ کذب تک جا پہنچے گا اور اللہ "الحق" ہے اور اس سے کذب کے صدور کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فضلِ حق خیرآبادی کا موقف شاہ اسمٰعیل شہید کے موقف پر واضح برتری رکھتا نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں فضلِ حق خیرآبادی نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے کہ:

اوّل ما خلق اللہ نوری

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی خلقت کے اعتبار سے اوّل اور اپنے ظہور کے اعتبار سے آخر تھے۔ یوں اللہ نے گویا اپنے کامل ارادے سے نظیرِ خاتم النبیین کا رستہ خود ہی بند فرما دیا۔

شاہ اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" کا احسان یہ ہے کہ اس نے اہلِ اسلام کو دین کے سرچشمۂ صافی و اصلی کی طرف پھر سے متوجہ ہونے میں مدد دی۔ اگر شاہ صاحب کے مزاج اور تحریر میں ضرورت

سے زیادہ شدت نہ ہوتی تو ان کے موقف کو معروضی انداز میں سمجھنے کی بہتر کوششیں ظہور میں آتیں۔ بہرحال المیہ یہ ہے کہ بدعات و توہمات کا یہ کھیل برعظیم پاک و ہند میں آج بھی اسی شدت اور نت نئی صورتوں میں جاری و ساری ہے۔ اب سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

اقبالؒ

حواشی از مصنف

۱۔ یادگارِ غالب ص ۷۲-۷۳

۲۔ تقویۃ الایمان ص ۴۶

۳۔ ایضاً ص ۷۷

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "اوّل ما خلق اللہ نوری"۔

۵۔ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (دہلوی) نے سلسلۂ چشتیہ کی تجدید و احیاء میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کے نزدیک طریقت بغیرِ شریعت بے معنی ہے اور صوفیائے خام کی "توحید" لایعنی ہے۔ یہ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ "مکتوباتِ کلیمی" ان کی مشہور کتاب ہے۔

۶۔ گمان ہے کہ غالب کا اشارہ اپنے سنّی و چشتی مرشد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب کی طرف ہے جن کی عظمت کا اعتراف سرسید اور بہادر شاہ ظفر نے بھی کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "تاریخِ مشائخِ چشت"۔ ص ۵۱۷-۵۱۹

۷۔ کلیاتِ غالب، فارسی: جلد اوّل، ص ۲۹۷-۲۹۸

۸۔ ایضاً ص ۳۰۰

۹۔ "جاوید نامہ" میں اس شعر کے حوالے سے زندہ رود اور غالب کا مکالمہ بہت فکر افروز ہے۔ دیکھیے۔ کلیاتِ اقبال، فارسی: ص ۱۴۷-۱۶۷

۱۰۔ کلیاتِ غالب، فارسی: جلد اوّل، ص ۳۰۲-۳۰۳۔ یاد رہے کہ مثنوی اوّلاً اس آخری شعر پر ختم ہو گئی تھی۔ بعد کے اشعار فضلِ حق خیر آبادی کی فہمائش کا نتیجہ تھے۔

۱۱۔ ایضاً: ص ۳۰۴

۱۲۔ تقویۃ الایمان: ص ۲۷-۲۸

۱۳۔ تفہیماتِ الٰہیہ: جلد اوّل، ص ۲۱۴۔ بحوالہ تجدید و احیائے دین: ص ۹۷-۹۸

۱۴۔ ایضاً : جلد دوم، ص ۴۵۔ بحوالہ ایضاً : ص ۱۰۳

۱۵۔ تفسیرِ ایّوبی: جلد دوم، ص ۹۳
۱۶۔ ایضاً ص ۹۵-۹۶
۱۷۔ امتناع النظیر: ص ۲۸
۱۸۔ ایضاً : ص ۳۲۴